محفل یاراں

سید حسین افسر

شہزادوں، محلوں اور شاہی ڈیوڑیوں کی ہوش ربا داستانیں، افسانے اور کہانیوں کی اگر چھان بین کی جائے تو اسکے اندر بہت گہرے راز چھپے ہوتے ہیں۔ اقتدار کی ہوس اور حکمرانی کا جنون شہزادوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنوں سے بھی بغاوت کریں اور دوسروں کو بھی زیر کرنے کے لئے ظالم و جابر اقدامات اختیار کریں جن سے دنیا کانپتی ہے۔ اس رنگ برنگی اور چمک دمک والی دنیا میں جو سامنے نظر آ رہا ہے وہ خود میں کیا ہے؟ کسی کو نہیں معلوم۔ ایک باریش، جبہ دستار والا عالم، خطیب، ذاکر، صوفی اور اللہ والا نظر آنے والا اندر سے کتنا شیطان ہے کچھ نہیں معلوم۔

اسلامی دنیا بھی ان منافقوں اور اقتدار پرستوں سے بھری ہوئی ہے۔ چہروں پر نور، پیشانی پر نمازوں کے گھٹے اور زبان میں انتہائی ملائمیت سے کوئی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا ہے کہ دنیا کا سب سے زیادہ متقی، پرہیز گار اور اللہ والا یہی ہے۔ تصویر بر عکس ہے۔ اسلام میں پہلے ہی یہ کہہ دیا گیا تھا کہ کسی کے لباس، تراش وخراش پر نہ جاؤ۔ ہم نے اسی دنیا میں دیکھ لیا کہ مظلوم فلسطینیوں کی زبانی مدد کرنے والے کتنے ہیں اور عملی قدم اٹھانے والوں کی تعداد کیا ہے؟

سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں جس طرح کے حالات پنپ رہے ہیں انکی کہانی طویل اور افسانے بہت گہرے ہیں۔ اس زمانے کی داستان ہے جب امریکہ کا قبضہ دنیا پر نہیں تھا دنیا پر انگریزوں کی حکومت تھی جس میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ ترکی، اسپین میں مسلمانوں کی حیثیت کو کم کرنے اور اپنی کٹھ پتلیوں کے ہاتھوں اقتدار سونپنے کی جو حرکت انگریزوں نے کی تھی اسکی باگ ڈور اب امریکہ بہادر کے ہاتھ میں ہے۔ مقدس کعبہ کی کلید یعنی کنجی اور جزیرۃ العرب پر اپنے پرچم کو لہرانے کی جس سازش کو انگریزوں نے انجام دیا تھا اب امریکہ اس سلسلہ کو آگے بڑھا رہا۔ حجاز مقدس کو سعودی عرب بنانے کا جو منصوبہ بہت پہلے بنایا گیا تھا اب اسکی حکمرانوں میں افراتفری کا عالم ہے۔ ایک ایسی چپقلش جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے آئندہ چند برسوں میں مصیبت بن سکتی ہے۔ ہم نے عرب فرمارواؤں کو ''ہولی کاؤ'' مقدس گائے سمجھ کر انکی مزمت نہیں کی، انکے ان حرکات وسکنات کی جانب توجہ نہیں دی جو مستقبل میں تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بن رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور مسلمانوں کی ناک اور انکے تشخص کو خطرہ لاحق ہے۔

سعودی عرب میں اقتدار کی جنگ کا انجام کیا ہوگا، اسکا اندازہ جو لوگ تاریخ اور دنیا کے تجربات پر نظر رکھتے ہیں انکو خوب معلوم ہے۔ شاہی محلوں کی سازشوں اور تخت و تاجوں کی دنیا کے قصے کسی سے چھپے نہیں ہیں۔

ایک کالم نگار نے تحریر کیا ہے کہ ''سعودی عرب میں گیارہ شہزادوں، چار وزیروں اور متعدد کاروباری شخصیات کی گرفتاری دنیا کے لیے بڑی خبر تھی، گرفتار ہونے والی تمام شخصیات سعودی عرب کے حوالے سے تو اہم ہی تھیں لیکن شہزادہ ولید بن طلال کی گرفتاری پر بین الاقوامی میڈیا ہیجانی کیفیت کا شکار تھا۔

گرفتاریوں کی خبر کے ساتھ ہر میڈیا گروپ نے شہزادہ ولید کے دنیا بھر میں پھیلے کاروبار پر الگ سے خبریں شائع کیں۔ عالمی میڈیا کی خبروں اور تبصروں کی وجہ سے اسٹاک مارکیٹوں اور تیل کی قیمتوں میں وقتی بھونچال بھی دیکھنے میں آیا اور شہزادہ ولید کی گرفتاری کی خبر کے بعد تیل کی قیمتیں دو سال کی بلند ترین سطح پر آ گئیں''۔

مغربی دنیا کے میڈیا نے اہم ترین شہزادے سلمان بن عزیز کے بارے میں پہلے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا کہ وہ خطرناک شخصیت کے مالک ہیں اور یہ نظر بھی آیا۔ امریکہ میں رہ چکے بادشاہ سلامت کے بلند اختر کی کمزوریوں کو ڈونالڈ ٹرمپ نے پہلے ہی بھانپ لیا اور بادشاہ سلامت سے یہ فرمائش کی کہ سلمان کو کراون پرنس کا عہدہ عطا کر دیا جائے۔ چنانچہ جو کراون پرنس تھے انکو بظاہر میٹھی میٹھی اور اندر اندر کڑوی مکالمہ بازی کے بعد چلتا کیا گیا، نائف، طلال اور دیگر کو بھی اس طرح سے معزول کیا گیا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔ ٹرمپ کے اس کارڈ میں بہت کچھ چھپا ہے جو وقت آنے پر ظاہر ہوگا۔ ہم کو بھی اس ارض مقدس سے انتہائی ہمدردی ہے اسی لئے ہم بھی یہ نہیں دیکھ سکتے کے رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب خدا اور کعبہ و مدینہ والی زمین پر خدا نہ خواستہ کوئی افراتفری مچے، لیکن وہ لوگ خود کیوں نہیں ان سازشوں کو سمجھ رہے ہیں جو وہاں حکمرانی کر رہے ہیں۔

شہزادہ ولید کی گرفتاری اور انکے سرمایہ کاری کے بعد مغربی میڈیا نے بتانا شروع کیا کہ انہوں نے دنیا کی اہم ترین کمپنیوں میں دولت لگا رکھی ہے۔ لیکن سرمایہ کاری ایک طرف مگر اندرون محل کی داستان یہی بتا رہی ہے کہ بہت پہلے سے کھچڑیاں پک رہی تھیں اور اچانک ایک دن یہ حقائق نمودار ہو گئے کہ سلمان بن عزیز کی ہی اب چلے گی۔ بہر حال پہلے سے ہی مسلم ممالک پر امریکہ یا مغربی طاقتوں کی اجارہ داری تھی ٹرمپ کی حکومت نے مزید شکنجہ کس کر یہ پیغام دے دیا ہے کہ ہماری بغیر اجازت ایک پتہ بھی نہیں کھڑک سکتا ہے۔ اللہ خیر کرے۔

اگلے ہفتہ محفل یاراں میں کچھ کڑوی میٹھی اور نرم وسخت باتیں لیکر پھر حاضر ہوں گا۔

husain.afsar@gmail.com

بات یوں نکلی کہ...

تمثال مسعود

غالبؔ نے اپنے ایک خط میں کہا تھا کہ مذکر اور مونث کے لیے لکھنؤ والوں کا اتباع کرنا چاہیے۔ غالبؔ کے اِس قول میں یوں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ جس کی گرفت کی جائے لیکن جب اِس معاملے پر ذرا غور کیا جاتا ہے تو کئی پیچیدہ پہلو سامنے آتے ہیں۔ جیسے اردو زبان کو معیاری زبان بنانے کی فکر کب سے شروع ہوئی اور اِس سے بھی بڑھ کر کہ اس کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ یہ تو تحقیق کا موضوع ہے جس پر سنجیدہ کام ہونا چاہیے۔ خیر آپ یہاں ذرا یہ دیکھئے کہ ۱۹رصدی کے آخر سے اِس کام کے لیے باقاعدہ کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور کئی انجمنیں بھی وجود میں آ گئی تھیں جیسے انجمن معیار ادب اور انجمن معراج الادب۔ اِن تحریروں اور انجمنوں میں اسم کی تذکیر اور تانیث، واحد کی جمع کیسے بنائی جائے، اور بامحاورہ زبان کے بارے میں سب سے زیادہ بحث ہوتی تھی؛ اور یہ بحث بیشتر شاعری کے حوالے سے ہی ہوتی تھی۔ یہ جو میں نے تین باتیں گنائی ہیں اُن میں 'بامحاورہ زبان' کے حوالے سے چند دلچسپ باتیں دیکھیے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی کی زبان کی تعریف میں اِس پر خاصا زور دیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب بڑی بامحاورہ زبان لکھتے ہیں یا بولتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ بامحاورہ زبان اچھی زبان کی پہچان ہے۔

لیکن یہ ایسا آسان کام نہیں ہے کیونکہ ذرا سے میں زبان بامحاورہ سے محاورے دار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک پروگرام میں ایک صاحب نے کہا، 'اب میں محترمہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ لکھنؤ کی چٹپٹی اور بامحاورہ زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔' آپ دیکھ رہے ہیں کہ اِس جملے میں محاورہ استعمال کیا گیا ہے لہٰذا یہ زبان بامحاورہ کہلائے گی۔ لیکن ذرا ٹھہریے، اِس زبان کو بامحاورہ ماننے میں ایک پریشانی ہے۔ سب سے اہم بات یہ دیکھنا ہوگی کہ یہ جملہ کس موقعے پر کہا جا رہا ہے۔ تو یہ موقع تھا ایک ادیب کی یاد منانے کا جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا؛ یعنی سوگواری کا موقع۔ اب آپ تصور کیجیے کہ سوگواری کے موقعے پر کہا جا رہا ہے کہ مرنے والے کے بارے میں کچھ چٹپٹی زبان میں بتائیے۔ ایسی صورت میں یہ ایک نامناسب بات ہوگئی اور جب یہ جملہ نامناسب ٹھہرا تو فصیح بھی نہیں رہا اور جب فصیح نہیں رہا تو بامحاورہ زبان سے اِس کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ آپ نے دیکھا کہ محاورے کا استعمال کرنے کے باوجود کیسے یہ جملہ بامحاورہ زبان کے درجے سے گر گیا ہے۔

بولنے میں ہی نہیں بلکہ تحریر میں بھی اِس کی مثالیں دکھائی دیتی ہیں جیسے ''ادبی خطوطِ غالبؔ'' کے دیباچے کا ایک حصہ دیکھیے:

''مرزا [غالبؔ] کے استغنا اور لاابالی پن نے اُن کا کلام کبھی اُن کے پاس جمع نہ ہونے دیا بلکہ نیز ہمیشہ اُن کا کلام لے جاتے تھے اور جمع کرتے رہتے تھے۔ اور اِس قدر حفاظت اور عزت سے رکھتے تھے کہ مرزا [غالبؔ] کو بھی اِس مجموعے کی ہوا نہ دیتے تھے۔''

اِس تحریر میں بھی وہی معاملہ ہے جس پر اوپر بات ہوئی یعنی محاورے تو استعمال کیے جا رہے ہیں لیکن جس سیاق و سباق میں بات ہو رہی ہے اُس میں یہ محاورے مناسب نہیں ہیں۔ جس کے نتیجے میں زبان محاورے دار تو بن جاتی ہے لیکن فصیح نہیں ہوتی۔ آپ ذرا غور تو کریں کہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے ضمن میں 'لاابالی پن' اور 'ہوا نہ دینا' کہنا کیسا لگ رہا ہے۔ اِن دونوں مثالوں میں بامحاورہ سے محاورے دار زبان کا یہ معاملہ کیوں کر پیدا ہو گیا، یہ سمجھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دونوں جگہ زبان کو بامحاورہ بنانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے وہ ''شعوری کوشش''، اصل بات جو کہنا ہے اُس کے اوپر شاید کچھ حاوی سی ہو گئی ہے۔ یہاں میں اپنے دائرے کو ذرا وسیع کر کے کہوں کہ فن کے ہر میدان میں فنکار کے لیے یہ مرحلہ بہت نازک اور محنت طلب ہوتا ہے کہ تخلیق کرنے کی 'شعوری کوشش' کو کیسے برتا جائے کہ سننے والے، پڑھنے والے، اور دیکھنے والے یعنی سامعین، قاری، اور ناظرین پر اثر تو ہو لیکن 'شعوری کوشش' کا وجود معدوم سا ہو جائے۔ بامحاورہ زبان کا بھی یہی معاملہ ہے کہ محاورہ استعمال تو ہو لیکن ایسا دکھائی نہ دے کہ اصل بات ہی خبط ہو جائے۔

اپنی بات ختم کرنے کے لیے میں غالبؔ پر ہی آتا ہوں۔ جب مرزا غالبؔ کو معلوم ہوا کہ منشی شیو نرائن اُن کے خط چھاپنا چاہتے ہیں تو غالبؔ نے اُن سے کہا کہ یہ تو 'سرسری' تحریریں ہیں، چھپنے کے قابل نہیں ہیں۔ خیر یہ تو غالبؔ کے کہنے کا انداز تھا، سبھی جانتے ہیں کہ غالبؔ کیسی زبردست بامحاورہ زبان لکھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ غالبؔ کی 'شعوری کوشش' کمال کے درجے پر پہنچ کر معدوم سی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہی غالبؔ کا اپنی زبان کو 'سرسری' زبان کہنا بھی پڑھنے والے کو کھٹکتا نہیں۔ ورنہ آپ سوچیے تو سہی کہ غالبؔ کے زمانے میں اور بعد کے اِن ڈیڑھ سو برسوں میں ایسی 'سرسری زبان' لکھنے والے کتنے ہیں؟

شوہروں کی وہ خصلت جو پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے

سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ انسانوں کی طرح چڑے بھی زن مرید ہوتے ہیں یعنی وہ اپنی ماداؤں کو خوش رکھنے کے لیے ہر طرح کے جتن کرتے ہیں اور ان کا من پسند دانہ دُنکا اور کیڑے مکوڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ ماہرین یہ بات پہلے سے جانتے ہیں روبن چڑیاں اپنی پوری زندگی میں ایک ہی جیون ساتھی بناتی ہیں اور یہ خاصیت انسانوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ البتہ اس مطالعے میں روبن چڑیوں کی انسانوں جیسی ایک اور بات یہ بھی سامنے آئی کہ جب ان کی مادائیں (بیویاں) انڈے دینے کی تیاری کر رہی ہوتی ہیں تو ان کے نر (شوہر) سارے جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں تاکہ اپنی ماداؤں کے لیے پسندیدہ ترین غذا ڈھونڈ کر لاسکیں لیکن بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ روبن چڑیوں کی مادائیں کچھ ایسی آوازیں بھی نکالتی ہیں جیسے اپنے نروں سے کچھ خاص چیز کھانے کی فرمائش کر رہی ہوں۔ ان ''فرمائشوں'' کے جواب میں نر اُن کے لیے مخصوص دانہ اور کیڑے مکوڑے وغیرہ تلاش کر کے لاتے ہیں جسے وہ خوش ہو کر کھاتی ہیں۔ مادہ روبن چڑیوں کا یہ معمول صرف ان دنوں ہی میں نہیں ہوتا کہ جب وہ انڈے دینے والی ہوتی ہیں بلکہ وہ کسی بھی وقت مخصوص چہچہاہٹ کے ذریعے اپنے نروں (شوہروں) کو ''کچھ الگ'' لا کر کھلانے کا ''حکم'' دیتی ہیں۔ روبن چڑیوں کے نر بہت ہی فرمانبردار قسم کے شوہروں جیسا برتاؤ کرتے ہوئے کوئی احتجاج یا نخرا کیے بغیر اپنی ماداؤں کا حکم بجالاتے ہیں اور انہیں خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ تحقیق سے یہی پتا چلتا ہے کہ زن مریدی صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں میں بھی نروں یعنی ''شوہروں'' کے حالات انسانوں سے کچھ مختلف نہیں ہوتے۔

اودھ دربار

سنڈے آگ اپنے قارئین جو اودھ بالخصوص لکھنؤ کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کیلئے قسطوار سلسلہ شروع کر رہا ہے۔

سنار

سونے چاندی کے سادے اور جڑاؤ گہنے نفیس ونازک بناتے ہیں اور ٹانکا دکھائی نہیں دیتا۔

سادے کار

دہری زہ کی انگوٹھیاں لکھنؤ کی خاص ایجاد ہے اور کہیں کا سادے کار نہیں بنا سکتا۔

حکاک

نگ تراشنے اور جلا دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

جوہری

سارے ہندوستان میں مانے ہوئے ہیں جو خالی پرکھنے میں فرد نہیں، جلا دینے اور جھوٹے کو سچا بنا دینے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ بلّور کو ہیرا بنا دیں، گٹا، پرت، دو پلکا چاہیئے بنوا لیجئے اور کیا مجال جو دوسری جگہ کا جوہری پرکھ لے۔

ملمع ساز

سونے چاندی کا ملمع بے مثل ہوتا ہے۔

رفوگر

شال میں رفو اور رنگ لکھنؤ سے بہتر کہیں نہیں ہوتا۔

رنگریز

کپڑا رنگنے میں کمال رکھتے ہیں۔ چھینٹ کے عام ہونے سے پہلے رنگ کے پھول بھی بناتے تھے، آبی، پیازی، اگرئی، پستئی، کاکریزی، بسنتی، شربتی، فالسئی، ملاگیری ہلکے اور سوفیانہ رنگ لکھنؤ سے بہتر کہیں نہیں رنگے جاتے۔

چھاپے گر

لحاف، رضائی کی فردیں، توشک اور پلنگ پوش، مارکین، چھالٹین اور غلتے پر بہت خوش وضع چھاپتے ہیں اور رنگ اتنا پکا ہوتا ہے کہ دھوئے دھوئے نہیں جاتا۔ لکھنؤ کی فردیں شہر شہر بکتی ہیں۔

چوڑی والے

چوڑیاں بھی لکھنؤ کی خاص صنعت ہے، چوڑی والی گلی اب تک اس کا مشہور بازار ہے۔ شہانی چوڑیاں لکھنؤ کی ایجاد ہے۔

درزی

اچکن، شیروانی، انگرکھا، پیجامے، گھٹنا، چوڑی دار، ٹوپی دو پلی، کشتی نما، گول اس برصغیر کا مہذب ترین اور ہندوستان کا قومی وسرکاری لباس خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔

دھنکیئے

چھٹانک بھر روئی میں پوری رضائی بھر دیتے ہیں۔

پھول والے

ہار، گجرے، پھولوں کے زیور، ان میں سونے چاندی کے جا بجا تار لکھنؤ کے پھول والوں کی ایجاد ہے۔ پھول والی گلی اس کا مرکز ہے۔

متفرق صنعتیں

مونڈھے، ٹاپے، ٹوکریاں، پٹارے، بٹیر کی کابک، طوطے کا پنجرہ کھڑادیں، سینگ کی کنگھیاں، کاٹھ کی پیالیاں، سرمہ، مسّی، پیچوان، سٹک، نیچہ، خمدار، مدریہ، گڑگڑی، ہردم تازہ، کہنی دار اور جلیبی دار قفلی، مشکیں، چھانویں، آتشبازی، لکڑی کی تختیاں، بیلن، پٹرے، کونڈے کٹھرے، ہاتھی دانت کی چیزیں، نواڑ، سیج بند چارپائی کے پائے سادے اور رنگین، لکڑی کے چھاپے۔ سیلیاں (کالی پوت کی چوڑیاں)، پوت کے کرن پھول، سادے اور نفیس علم، تعزیے (محرم میں) شکر کے اور مٹی کے کھلونے، چولھا چکی، چوگھڑے (دیوالی میں)، گڑیاں، لچکا، بادلہ، زری، زردوزی، کامدانی، دو پلی ٹوپی، انگرکھے، کرتے، تنچپی اور مُرّی کے کام کے گوٹے کے ہار روپہلے، گنگا جمنی اور زردوزی لکھنؤ کی ایجاد ہیں۔ (**جاری**)

مولانا **باقر شمس** کے طویل مضمون سے اقتباسات

دریا کے اندر علم کا دریا

☆ رضا علی عابدی (لندن)

کوئی مشکل ہی سے یقین کرے گا کہ دریائے سندھ کے پاٹ میں ویرن پڑے ہوئے علاقے میں، جسے کچے کا علاقہ کہتے ہیں، جہاں کچھ عرصے پہلے تک ڈاکوؤں، لٹیروں اور اٹھائی گیروں کا راج تھا، آج وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسکول تعمیر ہو گئے ہیں جن میں نہ صرف لڑکے بلکہ سینکڑوں لڑکیاں بھی تعلیم پا رہی ہیں۔ میں وہاں گیا تو جن عمارتوں کو میں پولیس اسٹیشن سمجھا تھا وہ جدید درس گاہیں تھیں۔ پولیس کا تو ذکر ہی کیا، بے چارے سپاہی اس علاقے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اسی ویرانے میں تنہا کھڑی ہوئی ایک ویران عمارت دیکھی جو پولیس نے ڈاکوؤں کو کچلنے کے لئے اپنی چوکی کے طور پر بنائی تھی۔ ڈاکوؤں کو اپنے ہتھیار چلانے اور نشانہ بازی کی مشق کرنے کے لئے اچھا ٹھکانا مل گیا اور عمارت پر اتنی گولیاں چلیں کہ پولیس کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔ میں گیا تو اسی شیر دریا کا یہ نظارہ بھی کیا جسے دیکھنے کے لئے میں تیس برس پہلے لدّاخ سے اس کے ساتھ ساتھ چلا تھا۔ صوبہ سندھ کے علاقے میں یوں نہیں ہے کہ دریا میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی بہہ رہا ہو۔ یہاں تو موسم موسم کا معاملہ ہے۔ کبھی جوش کا عالم ہو تو زور آور دریا ابل پڑتا ہے اور کبھی خاموش دھاروں کی طرح اِدھر بہنے لگتا ہے اور کبھی اُدھر۔ باقی علاقے سنسان رہتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی بستی ہے نہ آبادی۔ بس دریا کی سوکھی ہوئی تہہ ہے اور وہ بھی خوب زرخیز۔ یہی کچے کا علاقہ ہے۔ میں گیا تو پورے علاقے میں گندم کی نئی فصل پھوٹی تھی۔ تاحد نگاہ بالشت بالشت پودے اگے ہوئے تھے جیسے سارے بیج ایک ہی دن ڈالے گئے ہوں اور جیسے سارے پودے ایک ہی روز پھوٹے ہوں۔ ان نظاروں کے بیچ اسکولوں کی عمارتیں دیکھ کر جو احساس ہوا اسے کیا نام دوں حیران ہوں۔ راحت یا فرحت؟ مگر راحت بھی عمارتوں سے نہیں بلکہ اپنی اپنی جماعتوں میں سکون سے بیٹھ کر سر جھکائے کتابوں میں دھیان لگائے ہوئے بچوں کو دیکھ کر۔ اور اس سے بھی زیادہ ان استادوں اور استانیوں کو دیکھ کر جو ان دور دراز علاقوں میں جا کر اپنے فرض انجام دینے کے لئے تیار ہیں ورنہ مجھے بتایا گیا کہ ٹیچرز کی کتنی ہی آسامیاں خالی ہیں مگر کوئی ان علاقوں میں جانے پر آمادہ نہیں۔ مجھے ہر جماعت میں مستعد ایک استاد یا استانی نظر آئی۔ ان کے جذبے کو دل ہی دل میں داد دیتا رہا۔ ایک ٹیچر کو دیکھا جو بچوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کے ماڈل بنا رہے تھے، مثال کے طور پر کاریں، بسیں، جہاز اور مشینیں لیکن ان کی تازہ ترین ایجاد ان کی بنائی ہوئی اے ٹی ایم کیش مشین تھی جس میں سے نوٹ بھی نکل رہے تھے۔ بچے یوں شاد ہو رہے تھے جیسے یہ ان ہی کی ایجاد ہے۔ ایک اور خاتون ٹیچر کو دیکھا جنہوں نے حیران کر دیا۔ ان کی جماعت میں سب لڑکیاں تھیں جو تین قطاروں میں بیٹھی تھیں اور یقین کیجئے کہ ایک قطار ریاضی پڑھ رہی تھی، دوسری انگریزی اور تیسری قطار کی لڑکیاں اسلامی تاریخ کے عنوان کے تحت اس وقت امام حسنؑ کی زندگی کے حالات پڑھ رہی تھیں۔ ٹیچر نے اپنے بلیک بورڈ (تختہ سیاہ) کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ٹیچر نے عملے کی کمی کا کیا خوب حل نکالا، جو بھی نکالا، مجھے ششدر کر گیا۔

صاف ستھرے اسکول، ہر ایک میں باغ لگا ہوا۔ باغ میں بھی نرالے پھول جو کہیں اور نظر نہیں آتے۔ ہر اسکول میں عمدہ ٹوائلٹ، اکثر اسکولوں میں شمسی توانائی کا بندوبست کیونکہ دریا کے اندر ہونے کے باوجود اس علاقے میں غضب کی گرمی پڑتی ہے اور چھت کے پنکھوں کے بغیر گزارا مشکل ہے۔ ایک جگہ اسکول کی پردہ دار گاڑی دیکھی جو لڑکیوں کو لاتی لے جاتی ہے اور جسے ایک ٹریکٹر کھینچتا ہے۔ یہ گاڑی ان لوگوں نے خود ہی بنا لی ہے۔ یہ ساری درس گاہیں دیکھتے دیکھتے ہم کافی دور نکل گئے۔ آخر ایک اسکول پر پہنچے جو اگرچہ اونچائی پر بنایا گیا تھا لیکن دریا وہاں اپنا زور دکھاتا ہوگا چنانچہ بنانے والے نے ایک ڈیڑھ میٹر اونچی بنیادیں بنا کر ان کے اوپر اسکول کی پکی اور مضبوط عمارت اٹھائی تھی۔ اس نے طے کیا ہوگا کہ کتنی ہی طغیانی آئے، بچوں کی تعلیم میں خلل نہیں پڑنے دوں گا۔ سچ ہے، دنیا میں کمال کے لوگوں کی کمی نہیں۔

مگر ایک کمال کے شخص سے ملنا ابھی باقی تھا۔ دوپہر ہو گئی تھی اور اگرچہ ہر جگہ چائے اور کافی سے تواضع کی گئی مگر وہ جو بات سجے ہوئے دسترخوان میں ہوتی ہے وہ کہاں۔ گاڑی میں میرے میزبان آپس میں باتیں کر رہے تھے جن میں دریائی مچھلی کا ذکر تھا۔ بہت ہی اونچی نیچی بالکل ہی کچی اور کہیں کہیں زیر آب سڑکوں پر جھٹکے کھلاتی ہماری کار ایک شان دار مدرسے کے سامنے رکی۔ مدرسے کے صدر دروازے پر اس سے بھی شان دار ایک بزرگ کھڑے تھے، اچھا تن وتوش، سفید برّاق نورانی ڈاڑھی اور چہرے پر مسلسل بشاشت۔ پشت پر درس گاہ کی عمدہ عمارت جس کی پیشانی پر لکھا تھا: نظر محمد انڈھڑ مڈل اسکول۔ کسی نے تعارف کرایا اور نظر محمد انڈھڑ صاحب نے آگے بڑھ کر ہم سب کا خیر مقدم کیا۔ ایک ایک کو گلے سے لگایا اور اپنا اسکول دکھایا جس کی زمین اور عمارت خود انہوں ہی نے عطیہ کی تھی۔ بس انہیں اردو کم ہی آتی تھی اس لئے ہم ان سے علاقے کی کہانیاں نہ سن سکے۔ (اپنے نام کے یہ ہجے شاید انہوں نے خود ہی کئے تھے)۔ اسکول کے معائنے کے بعد ارشاد ہوا کہ اوطاق میں چلیے۔ سامنے ہی ہے، پیدل چل سکتے ہیں۔ اگلے ہی موڑ پر اوطاق آ گیا، اہالیانِ سندھ کا مہمان خانہ۔ جیسے کسی حویلی کا برآمدہ ہو، چھ بڑے بڑے در۔ اندر مونڈھے اور بہت سے پلنگ لگے ہوئے۔ کچھ میزیں آراستہ۔ ذرا دیر بعد اندر کہیں سے کھانے کے لوازمات آنے شروع ہوئے۔ ہر شخص ایک ایک قاب لا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ضیافت شروع ہو گئی۔ ہم دریا کے پاٹ میں بیٹھے تھے اس لئے بھنی ہوئی اور تلی ہوئی دریائی مچھلی ہمارے سامنے چن دی گئی۔ کچھ ہم نے کھائی، کچھ ہمارے قدموں میں گھومنے والی بلّیوں نے نوش کی، وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ دھلے اور وہیں تولئے فراہم ہو گئے۔ نظر محمد انڈھڑ صاحب بے حد مسرور تھے۔ ان کی آدھی باتیں سمجھ میں آئیں، آدھی ہم نے باقی لوگوں کے لئے چھوڑ دیں کیونکہ علاقے کے سارے ہی سرکردہ لوگ کھانے میں شریک ہو چکے تھے۔ اس روز اوطاق اور اس میں لگنے والی کچہری کا بڑا ہی لطف آیا اور یاد بھی نہ رہا کہ کبھی اس علاقے میں ڈاکوؤں کا راج تھا۔